ابو عمار زاہد الراشدی

غامدی صاحب اور خبر واحد

علما کے سیاسی کردار، کسی غیر سرکاری فورم کی طرف سے جہاد کے اعلان کی شرعی حیثیت، علماء کرام کے فتوے جاری کرنے کے آزادانہ استحقاق اور زکوۃ کے علاوہ کسی اور ٹیکس کی شرعی ممانعت کے حوالہ سے محترم جناب جاوید احمد غامدی صاحب کے بعض حالیہ ارشادات کے بارے میں ان کالموں میں کچھ گزارشات پیش کی تھیں۔ ہمارا خیال تھا کہ غامدی صاحب محترم ان مسائل پر قلم اٹھائیں گے اور ہمیں ان کے علم ومطالعہ سے استفادہ کا موقع ملے گا لیکن شاید ''پروٹوکول'' کے تقاضے آڑے آ گئے جس کی وجہ سے غامدی صاحب کے بجائے ان کے شاگرد رشید خورشید احمد ندیم صاحب نے ہماری گزارشات پر قلم اٹھایا اور معاصر روزنامہ جنگ میں ''تکبیر مسلسل'' کے عنوان سے شائع ہونے والے مضامین میں انہوں نے ان مسائل پر اظہار خیال کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

اب تک خورشید احمد ندیم صاحب نے دو نکات پر گفتگو کی ہے۔ پہلے مرحلے میں انہوں نے توضیحات کے عنوان سے ''خبر واحد'' کے حجت ہونے کے بارے میں ہماری گزارش پر تبصرہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ان کے ہاں سنت کا جو مفہوم سمجھا جاتا ہے، اسے پیش نظر رکھا جائے تو ''خبر واحد'' کے حجت ہونے یا نہ ہونے کی بحث کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی مگر ہمیں خورشید صاحب کے اس ارشاد سے اختلاف ہے جس کا آئندہ سطور میں ہم ذکر کریں گے اور اس سے قبل ہم ''خبر واحد'' کے بارے میں عام قارئین کے لیے تھوڑی سی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں تاکہ وہ صحیح طور پر اس بحث کو سمجھ سکیں۔

''خبر واحد'' کا لفظی معنی ''ایک آدمی کی روایت'' ہے اور محدثین کی اصطلاح میں خبر واحد اسے کہتے ہیں کہ قرون اولی یعنی صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں کسی حدیث نبوی کو روایت کرنے میں ایک ہی بزرگ متفرد ہوں اور دوسرا کوئی ان کے ساتھ اس بات کو بیان کرنے میں شریک نہ ہو۔ ایسی خبر کے بارے میں اہل علم کے درمیان اختلاف چلا آ رہا ہے کہ شرعی احکام کے ثبوت میں یہ خبر اور حدیث حجت ہے یا نہیں۔ جمہور محدثین اور فقہا کا موقف یہ ہے کہ کسی بھی ثقہ راوی کی روایت کردہ خبر واحد اگر قرآن کریم کی کسی نص صریح کے خلاف نہیں اور کوئی خبر متواتر یا اجماعی تعامل بھی اس کی نفی نہیں کر رہا تو وہ شرعاً حجت ہے اور اس پر عمل واجب ہے مگر بعض

اصولی فقہا کا موقف یہ ہے کہ خبر واحد کسی شرعی حکم کے وجوب کا فائدہ نہیں دیتی اور ہم نے سابقہ مضمون میں عرض کیا تھا کہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور جناب جاوید احمد غامدی کے مکتب فکر کا موقف ان اصولی فقہا کے قریب ہے اور اسی وجہ سے انہیں شادی شدہ مرد اور عورت کے زنا کا مرتکب قرار پانے پر اس کے لیے سنگ سار کرنے کی سزا کو شرعی حد کے طور پر قبول کرنے میں تامل ہے۔ اس کے جواب میں خورشید ندیم صاحب کا ارشاد ہے کہ سنت رسول کے بارے میں غامدی صاحب کی وضاحت کو سامنے رکھنے کے بعد خبر واحد کی حجیت کا سوال باقی نہیں رہتا چنانچہ وہ اس ضمن میں غامدی صاحب کے دو ارشادات نقل کر رہے ہیں:

''سنت سے مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید واصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے''۔

''اس کے بارے میں یہ بات بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں۔ وہ جس طرح صحابہؓ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماعی اور عملی تواتر سے ملی ہے اور ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔''

ہم ان دو اقتباسات سے جو مطلب سمجھ پائے ہیں وہ یہ ہے کہ سنت صرف وہی ہے جو دین ابراہیمی کے سابقہ تسلسل کے ساتھ نقل ہوتی چلی آ رہی ہے اور جناب نبی اکرم ﷺ نے تجدید واصلاح کے ساتھ اسے باقی رکھا ہے۔ اس کا لازمی مطلب اگر سامنے رکھا جائے تو جناب نبی اکرم ﷺ کا ہر وہ عمل اور قول سنت کے دائرہ سے نکل جاتا ہے جس کا دین ابراہیمی کے سابقہ تسلسل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے اور رسول اکرم ﷺ نے اپنی طرف سے نئی سنت کے طور پر اس کا اجرا فرمایا ہے۔ اسی طرح کسی سنت کے ثبوت کے لیے غامدی صاحب کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ وہ صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد امت کے اجماع اور عملی تواتر سے ثابت ہو اور جو سنت نبوی یا حدیث رسول اجماع اور تواتر کے ذریعہ ہم تک نہیں پہنچی، وہ غامدی صاحب کے نزدیک ثابت شدہ سنت نہیں، لہٰذا اگر حدیث وسنت کے تعین اور ثبوت کے لیے اس معیار کو قبول کر لیا جائے تو چوہدری غلام احمد پرویز اور ان کے رفقا کی طرح حدیث وسنت کے انکار کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ اس وقت حدیث وسنت کے نام سے روایات کا جو ذخیرہ امت کے پاس موجود ہے اور جس کی چھان پھٹک کے لیے محدثین تیرہ سو برس سے صبر آزما اور جاں گسل علمی جدوجہد میں مصروف چلے آ رہے ہیں، اس کا کم وبیش نوے فیصد حصہ خود بخود سنت کے دائرے سے نکل کر کالعدم قرار پا جاتا ہے۔ ہمیں تعجب اس بات پر ہے کہ خورشید احمد

ندیم صاحب ان اقتباسات کے ذریعہ خبر واحد کے حجت ہونے بلکہ سرے سے اس کے بیشتر حصے کو سنت
کرنے سے انکار فرما رہے ہیں مگر انہیں اس بات پر بھی اصرار ہے کہ سنت کے بارے میں ان کے نقطہ
سامنے رکھنے کے بعد خبر واحد کے حجت ہونے یا نہ ہونے کے اختلاف کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم
کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک خبر واحد بلکہ اجماع اور تواتر کے ذریعہ ثابت نہ ہونے والی کسی بھی سنت کی کو
اہمیت نہیں ہے مگر امت کے جمہور محدثین اور فقہا کے نزدیک جناب نبی اکرم ﷺ کا ہر وہ ارشاد اور عمل پر
اہمیت رکھتا ہے جو اہل علم کے طے کردہ اصولوں کے مطابق ثقہ اور مستند راویوں کے ذریعہ امت تک پہنچا ہے
جسے محدثین صحیح روایت کے طور پر امت کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

لطف کی بات یہ ہے کہ غامدی صاحب اور خورشید ندیم صاحب کے نزدیک کسی ایک سنت کے ثبوت کے
لیے تو صحابہ کرامؓ اور امت کا اجتماعی تعامل ضروری ہے لیکن اسی سنت کے مفہوم کے تعین، روایت کے طریق کی
قبولیت کے معیار اور صحت وضعف کے قواعد واصول کے بارے میں امت کے چودہ سو سالہ اجتماعی تعامل
جمہور محدثین وفقہا کا طرز عمل ان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ امت کے جمہور اہل علم کے طے کردہ
معیار کو قبول کرنے کے بجائے اپنے جداگانہ اصولوں کو حتمی معیار کے طور پر پیش کرنے پر مصر ہیں اور اس معاملہ
میں اجماع وتواتر اور تفرد وتوحد کا واضح فرق ان کے ذہن تک رسائی کا راستہ پانے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔

علما اور سیاست

خورشید احمد ندیم صاحب نے علما کے سیاسی کردار پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے
کہ علماء کرام کو عملی سیاست میں براہ راست فریق بننے کے بجائے اصولی سیاست اور رہنمائی کی سطح تک اپنی
سرگرمیوں کو محدود رکھنا چاہیے اور ساتھ ہی پاکستان کی پچاس سالہ سیاست کا تجزیہ کیا ہے کہ علما کا عملی سیاست
میں حصہ لینا علما اور دین دونوں کے لیے فائدہ کے بجائے نقصان کا باعث بنا ہے۔

جہاں تک علما کے عملی سیاست میں فریق بننے یا نہ بننے کی بات ہے، انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ
یہ جائز وناجائز کی بات نہیں بلکہ حکمت وتدبیر کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اس حوالے سے ان کے موقف اور ہمارے
نقطہ نظر میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہا کیونکہ ہم نے بھی ''موقع ومحل کی مناسبت'' کے عنوان سے ضرورت کے
وقت عملی سیاست میں علما کے فریق بننے کا دفاع کیا تھا جبکہ انہوں نے اسے ''حکمت وتدبیر'' کا نام دے
ہے۔ اب ظاہر ہے کہ حکمت وتدبیر نہ تو ایسی جامد شے ہے کہ ہر وقت ایک ہی حالت اور کیفیت میں رہے اور

ہی اس کی سطح ہر طبقہ، زمانہ اور علاقہ کے لیے یکساں رہتی ہے کہ ہر طرح کے حالات میں اس سے ایک ہی طرح کا نتیجہ برآمد ہو۔ اس لیے ہم بھی اس بحث کو آگے نہیں بڑھا رہے کیونکہ بے مقصد بحث اور لفظی نزاع کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ البتہ اپنی اس گزارش کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قومی زندگی میں علما کا اصل مقام علمی رہنمائی اور فکری قیادت ہے اور عملی سیاست میں براہ راست فریق نہ بننے کی صورت میں وہ زیادہ بہتر طور پر اپنی ذمہ داری کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں لیکن اگر کسی وقت حکمت و تدبیر کے تقاضے یا موقع محل کی مناسبت سے وہ شرح صدر کے ساتھ عملی سیاست میں خود سامنے آنے کو ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے لیے شرعاً یہ دروازہ بند نہیں ہے اور اسلامی تاریخ میں ان کے لیے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ، حضرت امام ابو حنیفہؒ، حضرت امام مالکؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے زعمائے امت کا واضح اسوہ اور شاندار روایات موجود ہیں جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں عملی سیاست میں نہ صرف دخل دیا بلکہ اس کے لیے گروہ بندی کی، محاذ آرائی کے دور سے گزرے اور تاریخ میں قربانی و ایثار اور استقلال و استقامت کے روشن باب قائم کیے۔

مگر خورشید ندیم صاحب کے تجزیے کے دوسرے حصے یعنی پاکستان میں علما کے سیاسی کردار کے حوالے سے ان کی رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ انہوں نے عملی سیاست میں علماء کرام کے فریق بننے کے جو نقصانات گنوائے ہیں، وہ ہمارے سامنے بھی ہیں اور ان میں سے بعض باتوں سے ہمیں اتفاق ہے لیکن ان کا یہ کہنا ہماری سمجھ سے بالاتر ہے کہ عملی سیاست میں حصہ لے کر علماء کرام دعوت کے منصب سے معزول ہو گئے ہیں کیونکہ ہماری نصف صدی کی تاریخ میں ماضی کی طرح یہ دونوں دائرے الگ الگ رہے ہیں اور آج بھی الگ الگ ہیں۔ دینی جدوجہد کی یہ فطری تقسیم کار چودہ سو سال سے چلی آ رہی ہے کہ علمی کام کرنے والے خاموشی سے اپنے کام میں مگن ہیں، دعوت و اصلاح کے میدان میں کام کرنے والے اپنے محاذ پر مصروف ہیں اور تحریکی مزاج کے اہل علم دین کا اپنا میدان کار رہے۔ پاکستان کی باون سالہ تاریخ پر نظر ڈالیں تو آپ کو یہ تمام شعبے یہاں بھی اپنے اپنے دائرہ کار میں مصروف دکھائی دیں گے اور ان میں بھی باہمی تعاون کی ایک خاموش روش نظر آئے گی۔ ملک میں ایسے اصحاب علم کی ایک بڑی تعداد آج بھی موجود ہے جو عملی سیاست کے جھمیلوں میں پڑے بغیر اپنا کام کر رہے ہیں اور عوامی سطح پر دین کی طرف بنیادی دعوت کا عمل بھی موجود ہے جو عملی سیاست سے الگ تھلگ رہ کر دین کی چند بنیادی باتوں کو ہر مسلمان کے ذہن میں ڈالنے کی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے۔ کیا خورشید ندیم صاحب کی ''حکمت و تدبیر'' اس تقسیم کار کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور کیا ان کے نزدیک حکمت و تدبیر اسی کا نام ہے کہ علم و دانش سے تعلق رکھنے والے تمام حضرات کو ایک ہی

طرح کے کام میں لگا دیا جائے اور تمام اذہان وافکار کو ایک ہی سطح، ایک ہی دائرہ اور ایک ہی رخ کا پابند بنا کر ہر کام کی نفی کر دی جائے؟ ہم ندیم صاحب محترم سے یہ سمجھنا چاہیں گے کہ عملی سیاست میں فریق بننے والے علما کی محدود تعداد کو سامنے رکھ کر وہ ملک بھر کے تمام اہل علم ودانش کو دعوت کے منصب سے معزول کرنے کا حکم کس بنیاد پر صادر کر رہے ہیں؟

پھر خورشید ندیم صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ علما کی سیاسی جدوجہد کی وجہ سے ملک دستوری لحاظ سے اسلامی ہے اور قانون سازی میں یہ ضمانت موجود ہے کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنے گا۔ ہمارے خیال میں اسی بات کو ایک اور رخ سے دیکھا جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی کہ عملی سیاست میں علما کے فریق بننے کی وجہ سے پاکستان اب تک سیکولر ریاست بننے سے بچا ورنہ اگر پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ موجود نہ ہوتے تو قرارداد مقاصد کبھی منظور نہ ہوتی۔ ۱۹۷۱ء کی دستور ساز اسمبلی میں مولانا مفتی محمودؒ، مولانا عبد الحقؒ، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا عبد المصطفیٰ ازہریؒ، پروفیسر غفور احمد اور مولانا ظفر احمد انصاریؒ موجود نہ ہوتے تو اسلام کے سرکاری مذہب ہونے اور قرآن وسنت کے مطابق قانون سازی کی ضمانت جیسی بنیادی دفعات دستور کا حصہ نہیں بن سکتی تھیں اور ۱۹۷۴ء میں یہی حضرات قومی اسمبلی کے رکن نہ ہوتے تو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کا مسئلہ کبھی حل نہیں ہو سکتا تھا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ خورشید ندیم صاحب اس سارے کام کو مولانا ظفر احمد انصاری کے کھاتے میں ڈال کر انہیں عملی سیاست سے دور رہنے والا بزرگ قرار دے رہے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس دور کے دستور سازی کے عمل سے ہی سرے سے بے خبر ہیں۔ مولانا ظفر احمد انصاری کی خدمات اور کردار سے انکار نہیں لیکن وہ دستور ساز اسمبلی اور قومی اسمبلی میں اس ٹیم کا ایک حصہ تھے جس میں مذکورہ بالا اکثر بزرگ شامل تھے اور ان کی قیادت مولانا مفتی محمود کر رہے تھے جبکہ عملی سیاست سے مولانا ظفر احمد انصاری کے دور رہنے کی کیفیت یہ تھی کہ وہ ۱۹۷۱ء کے الیکشن میں کراچی سے آزاد امیدوار کے طور پر الیکشن لڑ کر دستور ساز اسمبلی اور پھر قومی اسمبلی کے رکن بنے تھے اس لیے اگر وہ اس سارے انتخابی عمل سے گزر کر بھی ''عملی سیاست سے دور رہنے والے بزرگ'' قرار پا سکتے ہیں تو مذکورہ بالا دیگر بزرگوں کو یہ سہولت دینے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔

ہمارے خیال میں موجودہ عالمی حالات اور شدید بین الاقوامی دباؤ کے تناظر میں علما کا پاکستان کو سیکولر ریاست بننے سے روکے رکھنا ہی ایک ایسی بنیادی کامیابی ہے جس کی خاطر عملی سیاست کے تمام مبینہ نقصانات برداشت کیے جا سکتے ہیں۔